POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 17-18 February 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان

اشاعت کا 87واں سال

Date of Publication: 16-02-2026 • Price: 5/- • 22-28 February 2026 • Issue: 8 • Vol:85

۲۲ تا ۲۸ فروری ۲۰۲۶ء • شمارہ: ۸ • جلد: ۸۵

صحتِ زبان (۴۰)

رؤف پاریکھ

اَلحمدُ للہ، بَحمدِ اللہ اور للہ الحمد

بعض لوگوں کی اردو کا ذکر آتا ہے تو ہمارا وہی حال ہوتا ہے جو کلکتے کا ذکر آنے پر غالب کا ہوتا تھا، یعنی:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

کلکتے کے ذکر پر غالب، بقولِ غلام رسول مہر، وہاں کے شاداب سبزہ زاروں کو یاد کرتے اور ان کے سینے میں تیر لگتا[۱]۔ لیکن ہمارے سینے پر تیر بعض لوگوں خاص کر طالبِ علموں کی اردو کا ناگفتہ بہ حال دیکھ کر لگتا ہے۔ اور طالبِ علموں کو تو چھوڑیے، بعض کالم نگار بھی اردو املا کو دَھتا بتاتے ہیں۔ طالبِ علموں کی خدمت میں عرض ہے کہ پلیٹس کے مطابق دھتا (دھ مفتوح، ت بلا تشدید) کا مطلب ہے دھتکار، دور بھگانے کا عمل، ٹال مٹول[۲]۔ فرہنگِ آصفیہ نے اس لفظ کا تلفظ دَھتا (دھ مفتوح، ت بلا تشدید) لکھا ہے اور معنی میں ٹال مٹول اور دھتکار کے علاوہ حیلہ، مکر، فریب، دھوکا بھی لکھا ہے[۳]۔ لیکن پلیٹس دُھتّا اور دَھتا میں امتیاز کرتا ہے اور اس کے نزدیک دھوکا، چال بازی وغیرہ کے مفہوم میں دُھتّا (دھ مضموم، ت مشدد) ہے۔ نوراللغات نے بھی دَھتا (دھ مفتوح، ت بلا تشدید) لکھا ہے اور نوراللغات کے مطابق دَھتا بتانا کے ایک معنی ٹال دینا، چھوڑ دینا، ترک کرنا بھی ہیں[۴]۔

خیر، بات ہو رہی تھی اردو کے حال کی۔ مثلاً یہی دیکھیے کہ ایک صاحب نے ایک اردو اخبار میں کالم لکھا اور اس کا عنوان رکھا 'الحمداللہ' [کذا]۔ اللہ معاف کرے، یہ غلط املا اُنھیں کا لکھا ہوا ہے اور جلی حروف میں چھپا ہے۔ ہم صرف نقل کرنے کے گناہ گار ہیں۔ دراصل انھوں نے اس میں دو الف لکھے ہیں یعنی ایک الف اضافی لکھا ہے۔ اس مرکب میں ایک ہی الف چاہیے اور درست املا 'الحمد للہ' ہے۔ الحمدُ للہ کا تلفظ ہے: اَل۔حَم۔دُ۔لِل۔لاہ۔ لیکن اضافی الف کے ساتھ اس ترکیب کو لکھنے سے اس کا تلفظ بدل گیا اور مفہوم بھی۔ افسوس تو یہ ہے کہ ایڈیٹر اور سب ایڈیٹر اور پروف خواں سب نے اس غلطی کو بھی دَھتا بتایا۔ کم از کم یہی خیال کر لیتے کہ یہ الفاظ قرآن شریف کی پہلی سورہ یعنی 'فاتحہ' کے ہیں اور یہ غلط املا ایک طرح سے نعوذ باللہ قرآن شریف کی تحریف ہے۔

'حمد' کے لفظی معنی تو تعریف، ثناء اور مدح ہی کے ہیں لیکن اس کے مفہوم میں شُکر بھی شامل ہے۔ قرآنی الفاظ کی بعض لغات کے مطابق شکر لفظ 'حمد' کے مفہوم کا جزوِ غالب ہے اور اس لفظ کے ترجمے کا حق ادا کرنے کے لیے یا تو اس کے مفہوم میں 'تعریف' کے ساتھ 'شکر' کا لفظ ملانا ہوگا یا پھر اس کو شکر ہی کے لفظ سے تعبیر کرنا مناسب ہوگا[۵]۔ مہذب لکھنوی نے اپنی لغت میں لکھا ہے کہ الحمد للہ کا مفہوم ہے: تمام تعریفیں اللہ ہی کے واسطے ہیں[۶]۔ یہ لفظی ترجمہ ہے۔ دیگر لغات کے مطابق الحمد للہ کا مفہوم ہے خدا کا شکر ہے اور یہ کامیابی، خوشی یا نعمت کے اعتراف میں بولا جاتا ہے نیز مزاج پُرسی کے جواب میں اور چھینک آنے پر بھی الحمد للہ کہتے ہیں[۷]۔ کچھ لوگ الحمد للہ میں ایک اضافی 'ل' (لام) بھی لکھ دیتے ہیں یعنی الحمدلللّٰہ، یہ بھی غلط املا ہے۔ الحمد للہ کے املا میں یہ غلطی غالباً اس لیے ہوتی ہے کہ اس میں 'الحمد' کے بعد 'للہ' ہے اور اس میں پہلے لام کے نیچے زیر ہے اور اسے "لِل۔لاہ" پڑھا جائے گا لیکن کچھ لوگ اس املا پر الجھتے ہیں اور اسے ناکافی سمجھ کر اس میں ایک اور 'ل' (لام) لکھ دیتے ہیں۔ بلکہ فرہنگِ آصفیہ میں 'للہ' اور 'للہ الحمد' کا اندراج ہے لیکن اس کی اسناد میں کہیں 'للہ' کے بجائے لللّٰہ [کذا] بھی لکھا ہے یعنی دو کے بجائے تین لام لکھے ہیں جو یقیناً سہوِ کاتب ہے۔ اس میں دو لام (ل) کافی ہیں، تیسرے لام کی ضرورت نہیں یعنی اسے 'للہ' ہی لکھا جائے گا۔ فرہنگِ آصفیہ کے مطابق 'للہ' کے ایک معنی ہیں اللہ کے لیے، خدا کے لیے، برائے خدا۔ دوسرے معنی ہیں: اللہ کے نام پر، خدا کے نام پر، یہ خیرات وغیرہ کے لیے آتا ہے، جیسے کبھی کچھ للہ بھی دیا کرو۔ للہ الحمد کا تلفظ یوں کیا جائے گا: لِل۔لا۔ہِل۔حَم۔د۔ فرہنگِ عامرہ نے للہ الحمد کے لفظی معنی دیے ہیں: واسطے اللہ کے تعریف ہے[۸] (یعنی تعریف اللہ کے لیے ہے)۔ دراصل للہ الحمد میں بھی حمد و مدح کے ساتھ شکر کا مفہوم موجود ہے۔

اسی طرح کی ایک اور ترکیب بَحمدِ اللہ ہے۔ اس کا املا بھی بعض لوگ غلط لکھتے ہیں اور اس میں سے الف اُڑا دیتے ہیں اور اسے 'بحمدللہ' [کذا] لکھتے ہیں۔ حالانکہ یہاں الف ضروری ہے۔ بحمد اللہ میں 'ب' کے نیچے زیر ہے اور دال کے نیچے بھی زیر ہے اور الف غیر ملفوظی ہے یعنی یہاں الف لکھیں گے لیکن پڑھیں گے نہیں۔ بحمد اللہ کا تلفظ یوں ہوگا: بِ۔حم۔دِل۔لاہ۔ بَحمدِ اللہ کے معنی بورڈ نے یہ دیے ہیں: خداتعالیٰ کا شکر ہے[۹]۔ نوراللغات نے بحمد اللہ کے معنی دیے ہیں: خدا کا شکر ہے، خدا کے فضل سے اور اس کی سند میں محسن کاکوروی کا یہ شعر دیا ہے:

کہا قاصد سے، کہہ دینا، نہ لکھیں خط کبھی ہرگز
بحمد اللہ نکلی رسمِ پیغامِ زبانی کی

امیر مینائی نے بحمد اللہ کے معنی میں لکھا ہے: "خدا کے شکر کے ساتھ"۔ امیر نے مزید لکھا ہے: "شکر کرنے کی جگہ استعمال کرتے ہیں"[۱۰]۔ مہذب نے بحمد اللہ کے یہ معنی دیے ہیں: اللہ کی تعریف کے ساتھ اور مزید لکھا ہے کہ عام بول چال میں شکرِ خدا کے معنی میں بولتے ہیں[۱۱]۔ یوں کہنا چاہیے کہ بحمد اللہ میں ثنا و حمد کے ساتھ شکر کا مفہوم بھی موجود ہے۔

طالبِ علموں کی خدمت میں عرض ہے کہ ان تراکیب کا درست املا ہے: الحمد للہ، بحمد اللہ اور للہ الحمد۔ رہے کالم نگار تو ان کی تصحیح ہم کیسے کر سکتے ہیں۔ بقولِ غالب:

ع یہ تاب، یہ مجال، یہ جرأت نہیں مجھے

قراۃ العین نہیں، قُرّۃ العین

ایک بار یونیورسٹی میں ہم نے قرۃ العین نامی ایک طالبہ کو ڈانٹا کہ آپ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پہنچ گئی ہیں مگر اردو میں اپنا نام بھی درست نہیں لکھ سکتیں، 'قرۃ' میں الف کہاں سے آ گیا؟ دراصل اس نے پرچے میں اپنے نام کے ہجے میں ایک اضافی الف لکھ دیا تھا یعنی قرۃ العین کے بجائے قراۃ العین۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ کہے گی غلطی سے الف زیادہ لکھ دیا تھا۔ لیکن کہنے لگی کہ آج تک کسی نے بتایا ہی نہیں کہ اس کا درست املا کیا ہے۔ اسکول اور کالج میں بھی اسی طرح لکھتی تھی اور کسی استاد یا استانی نے کبھی تصحیح نہیں کی۔ اس پر 'انا للہ' پڑھنے کے سوا کیا چارہ تھا۔ لیکن یہ شکر کا موقع بھی تھا کہ کم از کم سچ تو بولا۔ الحمد للہ۔

افسوس تو ان والدین پر ہے جنھوں نے نام تو رکھا قرۃ العین، لیکن بچی کو نہ کبھی درست ہجے بتائے اور نہ اس کے نام کا مفہوم ہی بتایا۔ اس عربی ترکیب قرۃ العین میں قُرَّۃ میں قاف (ق) پر پیش اور رے

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

(ر) پر تشدید کے ساتھ زبر ہے۔عربی میں قرّۃ کا مادّہ ق۔ر۔ر ہے۔ قُرَّۃ یا قرّت کے لفظی معنی ہیں ٹھنڈک۔ یہ خوشی کے مفہوم میں بھی ہے[12]۔ اور عین کے معنی ہیں آنکھ۔قرۃ العین مرکبِ اضافی ہے۔گویا اس کا مفہوم ہوا آنکھ کی ٹھنڈک، مجازاً وہ جسے دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوں، یعنی جسے دیکھ کر سکون اور خوشی حاصل ہو، جو بہت عزیز ہو[13]۔ بالعموم اولاد کو بھی آنکھ کی ٹھنڈک کہتے ہیں۔اس بے چاری کو اس کے نام کا مطلب بتایا اور کہا کہ 'قرۃ' میں الف نہیں ہے اور صحیح ترکیب ہے: قرّۃ العین۔

ترادفی مرکبات اور قرض وام

اردو میں ایک مرکب مستعمل ہے: بہی کھاتے۔لیکن بچپن میں ہم 'بہی کھاتے' کو 'یہی کھاتے' پڑھا کرتے تھے اور حیران ہوتے تھے کہ یہ کون سے کھاتے ہیں جن کا ذکر پہلے نہیں آیا لیکن انھیں 'یہی' کہا جارہا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لفظ 'بہی' (ب مفتوح، ی معروف) ہے اور سنسکرت سے اردو میں آیا ہے۔بہی کھاتے کی ترکیب میں بہی کا مفہوم ہے حساب کی کتاب[14]۔

بعض اوقات کسی لفظ یا مرکب میں ایک حرف کو درست نہ پڑھنے کی وجہ سے اسی طرح کی غلطی ہوجاتی ہے۔ان میں سے ایک مرکب ہے قرض وام۔قرض کے بعد دوسرا لفظ یہاں وام ہے (واو سے)،لیکن بعض لوگ اسے دام (دال سے) لکھتے اور پڑھتے ہیں۔لیکن یہاں واو سے وام ہے۔وام (واو سے) فارسی کا لفظ ہے اور معنی ہیں ادھار، قرض[15]۔صحیح ترکیب قرض وام ہے۔

ممکن ہے کوئی سوال کرے کہ جب قرض کہہ دیا تو پھر اسی کا ہم معنی وام کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہماری زبان میں ایسے کئی مرکبات رائج ہیں جن میں ہم معنی یا مترادف الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور ان کے درمیان واو عطف بھی نہیں آتا۔وحیدالدین سلیم نے ایسے مرکبات کو مرکبِ ترادفی کا نام دیا اور کہا کہ ایسے مرکبات کے دونوں اجزا باہم مرادف ہوتے ہیں اور بیچ میں کوئی علامت ربط کے لیے نہیں لائی جاتی۔ پھر اس کی مثالیں دی ہیں[16]۔شوکت سبزواری نے بھی ایسے ترادفی مرکبات کا ذکر کرتے ہوئے یہ مثالیں دی ہیں: بھلا چنگا، خاک دھول، اچھل کود، کتر بیونت، بھولا بھٹکا[17]۔ان میں سے بعض وضعِ اصطلاحات میں بھی درج ہیں۔

ان مثالوں میں سبزواری صاحب نے سوائے ایک لفظ 'خاک' کے، جو فارسی ہے، سب اردو/ہندی کے الفاظ استعمال کیے ہیں،لیکن یہ عاجز طالبِ علم عرض کرتا ہے کہ عربی فارسی کے الفاظ کے ساتھ بھی ترادفی مرکبات اردو میں مستعمل ہیں جن میں دو ہم معنی الفاظ بغیر واوِعطف کے لائے جاتے ہیں مثلاً حیلہ بہانہ، جیسے: ابھی تو حیلے بہانے سے ٹال دو (حیلہ عربی ہے اور بہانہ فارسی، دونوں کے درمیان واوِعطف نہیں لاتے)۔اسی طرح صلاح مشورہ، جیسے: بعد میں صلاح مشورہ کرکے کچھ کہیں گے (صلاح بھی عربی ہے اور مشورہ بھی)۔

اس کے علاوہ اردو/ہندی الفاظ کے ساتھ بھی عربی یا فارسی کا لفظ جوڑ کر ترادفی مرکبات بنالیے جاتے ہیں، مثلاً ڈر خوف، جیسے وہاں کوئی ڈر خوف نہیں ہے (ڈر اردو/ہندی ہے اور خوف عربی)۔اسی طرح کپڑا لتّا، جیسے: وہ خالی ہاتھ تھا، کپڑا لتا کچھ پاس نہ تھا (کپڑا اور لتا دونوں اردو/ ہندی ہیں)۔پاک صاف، جیسے پاک صاف ہوکر عبادت کرو (پاک فارسی ہے، صاف عربی)۔اسی طرح بعض اوقات رنگ کی گہرائی یا شدت کو واضح کرنے کے لیے بھی اردو میں ایک ہی رنگ کے لیے دو لفظ لاتے ہیں، جیسے کالا سیاہ (کالا اردو/ہندی ہے اور سیاہ فارسی، اور ایک ہی مفہوم ہے)۔ لال سرخ (سرخ فارسی ہے)۔حالانکہ یہ بظاہر تکرار ہے اور غیر ضروری ہے لیکن یہ شدت یا زور کو ظاہر کرنے کے لیے ہے اور رائج ہے لہٰذا درست ہے، کم از کم بول چال کی حد تک۔

ہماری زبان میں اس طرح کے ترادفی مرکبات خاصی تعداد میں رائج ہیں، خواہ ایک ہی زبان کے دو مترادف الفاظ لائے جائیں یا دو الگ الگ زبانوں کے۔اس کی اور بھی مثالیں ہیں، جیسے: شادی بیاہ، کود پھاند۔ان میں واوِعطف لانا فصاحت کے خلاف ہوگا۔خود وحیدالدین سلیم نے 'کار بار' کی مثال دی ہے (جس میں کار اور بار دونوں فارسی کے ہیں) لیکن اس پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ یہ ترکیب واوِعطف کے ساتھ یعنی 'کاروبار' کی شکل میں زیادہ رائج ہے اور ہم یہاں ان ترادفی مرکبات کا ذکر کررہے ہیں جن میں دو ہم معنی لفظ بلا کسی حرفِ عطف کے آتے ہیں۔عرض ہے کہ 'کار بار' بھی مروج و مستعمل رہا ہے اور یہ واوِ عطف کے ساتھ بھی رائج ہے۔یاد رہے کہ یہاں مترادف یا ہم معنی الفاظ کے درمیان واوِعطف کا ذکر ہے اور دیگر عطفی مرکبات (جن میں مثلاً متضاد یا مختلف المعنی الفاظ کے درمیان واوِعطف آتا ہے) کا ذکر پھر کبھی کریں گے، ان شاءاللہ۔

مختصراً یہ کہ قرض وام بھی ایک ترادفی مرکب ہے، اس میں وام واو سے ہے اور یہ واوعطف کے بغیر ہی آتا ہے۔قرض عربی ہے اور وام فارسی۔وام لینا یعنی قرض لینا، مستعار لینا۔ غالب کے کلام میں بھی مرکب 'وام لینا' آیا ہے۔کہتے ہیں:

نگاہِ چشمِ حاسد وام لے اے ذوقِ خود بینی
تماشائی ہوں وحدت خانۂ آئینۂ دل کا

وام دینا یعنی ادھار دینا۔شاد عظیم آبادی نے کہا ہے:

کیا اس سے بحث مفت ہمیں دے یا وام دے
احسان ہے اگر بہ سبیلِ دوام دے

حواشی:

۱۔ نوائے سروش (شرحِ دیوانِ غالب)، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، سنہ ندارد)، ص ۸۵۳۔

۲۔ A Dictionary of Urdu, Classical Hindi and English، (مرتبہ جان ٹی پلیٹس John T. Platts)، لندن: کراسبی لاک وڈ اینڈ سنز، ۱۹۱۱ء (اشاعتِ اول ۱۸۸۴ء)۔

۳۔ (مرتبہ سید احمد دہلوی)، (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۷۷ء)۔

۴۔ (مرتبہ نورالحسن نیّر کاکوروی)، (اسلام آباد: نیشنل بک فاونڈیشن، ۱۹۸۹ء)۔

۵۔ مثلاً ملاحظہ ہو: امین احسن اصلاحی، قاموسِ الفاظ و اصطلاحاتِ قرآن (مرتبہ اورنگ زیب اعظمی)، (لاہور: دارالتذکیر، ۲۰۰۵ء)؛ نیز قاموس القرآن (مرتّبہ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی)، (کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۹۴ء) (طباعتِ نو)۔

۶۔ مہذب اللغات، جلد اول (مرتبہ مہذب لکھنوی)، (لکھنؤ: محافظِ اردو بک ڈپو، ۱۹۵۸ء (؟))۔

۷۔ مثلاً: اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد اول (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۷۷ء)؛ نیز مہذب اللغات، محولۂ بالا۔

۸۔ (مرتبہ عبداللہ خویشگی)، (اسلام آباد: مقتدرۂ قومی زبان، ۱۹۸۹ء)۔

۹۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد دوم (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۷۹ء)۔

۱۰۔ امیر اللغات، جلد سوم (مولفہ امیر مینائی، مرتبہ رؤف پاریکھ)، (لاہور: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۲۰۱۰ء)۔

۱۱۔ مہذب اللغات، جلد دوم (مرتبہ مہذب لکھنوی)، (لکھنؤ: محافظِ اردو بک ڈپو، ۱۹۶۰ء)۔

۱۲۔ A Comprehensive Persian-English Dictionary (مرتبہ ایف اسٹین گاس F. Steingass) لاہور: سنگِ میل ۲۰۰۰ء، (عکسی طباعت، اشاعتِ اول ۱۸۹۲ء)۔

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ جدید ہندی اردو لغت، مبنی بر دو جلد (مرتبہ نصیر احمد خاں)، (دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو، ۲۰۰۵ء)۔

۱۵۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد ۲۱ (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۲۰۰۷ء)۔

۱۶۔ وضعِ اصطلاحات (کراچی: انجمن ترقیِ اردو، ۱۹۶۵ء)، ص ۲۴۸ (اشاعتِ پنجم)۔

۱۷۔ اردو لسانیات (کراچی: مکتبہ تخلیقِ ادب، ۱۹۶۶ء)، ص ۱۴۸۔

شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف پاکستان،، یونیورسٹی روڈ،
کراچی-75270 (پاکستان)
E-mail: drraufparekh@yahoo.com

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

میرے مضامین (مجموعۂ مضامین ومقالات)	ڈاکٹر ماجد دیوبندی	300/-
نسخۂ حفیظ الدین احمد	اطہر فاروقی	1000/-
سرودِ عشق	شاہ رُخ جمال	200/-
گل دوگانہ	سیّد کاشف رضا	300/-
مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	700/-
مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں)	خلیق احمد نظامی	4500/-
نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ)	معصوم مرادآبادی	250/-
ہمارا شہر اُس برس (گیتا نجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	700/-
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا	سرورالہدیٰ	500/-
1857 کی اَن کہی حیرت انگیز داستانیں	شمس الاسلام	300/-
دیووں کا ظہور (الوک اگروال/ بینک اگروال)	مترجم: سیّد وجاہت مظہر	500/-
غزل اور فنِ غزل	ڈاکٹر نریش	200/-
فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	سیّد رضوان علی ندوی	
	رؤف پاریکھ	250/-
مشاہیر ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام	ابراہیم افسر	600/-
منیب الرحمٰن کی ایک صدی	بیدار بخت/ انور احمد	400/-
اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میاں من وتو (تحقیقی وتنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-
میرا جنون اردو (خطبات ومضامین)	طاہر محمود	700/-
میر کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی)	صدف فاطمہ	400/-
کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق وتوازن	ڈاکٹر نریش	250/-
تحقیقی مباحث	رؤف پاریکھ	300/-
چند فکری وتاریخی عنوانات	پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن	400/-
ریت سمادھی (گیتا نجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	900/-
حکمِ سفر دیا تھا کیوں	شانتی ویرکول	200/-
عہدِ وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کے چند اہم پہلو	اقتدار عالم خاں	350/-
قدرت کا بدلا (موسم کا بدلاؤ)	سیّد ضیاء حیدر	600/-
کتابیاتِ حالی	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	300/-
یہ تو عشق کا ہے معاملہ	ڈاکٹر ہلال فرید	300/-
جب دیوں کے سر اُٹھے	ڈاکٹر ہلال فرید	360/-

حالی اور سرسیّد

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی

خواجہ الطاف حسین حالی سرسیّد کے معاصرین میں نہیں بلکہ رفقا میں سے تھے۔ سرسیّد سے حالی کی پہلی ملاقات علی گڑھ میں منعقدہ سائنٹفک سوسائٹی کے جلسے میں ہوئی تھی۔ حالی اس جلسے میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ساتھ سرسیّد سے ملاقات کی غرض سے شریک ہوئے تھے جب کہ سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد 1864 میں رکھی جا چکی تھی۔ حالی نے اسی سال 'مولودِ کعبہ' بھی لکھی تھی۔ 'تہذیب الاخلاق' حالی اور سرسیّد کے مابین روابط کا مثبت و مستحکم ذریعہ ثابت ہوا جس کا ذکر حالی نے 'حیاتِ جاوید' کے غالباً پانچویں باب میں کیا ہے، جو صفحہ 164 پر محفوظ ہے۔ حالی نے بھی اس رسالے کے اغراض و مقاصد سے بحث کرتے ہوئے سرسیّد کی آرا سے اتفاق کیا ہے کہ یہ رسالہ اصلاحی نوعیت کا ہے جو علوم و فنون کے فروغ و ارتقا کے لیے جاری کیا گیا ہے۔

'تہذیب الاخلاق' کے مختلف ادوار پر نظرِ ثانی کی جائے تو اسے تین ادوار پر منقسم کیا جا سکتا ہے جو اس طرح ہے:

پہلا دور: 24 دسمبر 1870 تا 20 ستمبر 1875
دوسرا دور: 23 اپریل 1879 تا 28 جولائی 1881
تیسرا دور: 17 اپریل 1894 تا 3 فروری 1897

ان سبھی میں حالی کی تحریریں کسی نہ کسی صورت میں شائع ہوتی رہیں۔ 'تہذیب الاخلاق' کے بارے میں حالی نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''تہذیب الاخلاق کی تحریک کے ذریعے بے شمار اسلامی مدرسہ ہندستان میں قائم ہوگئے اور برابر ہوتے جاتے ہیں۔''

حالی کی معرکۃ الآرا 'مسدس حالی' بھی پہلی بار 'تہذیب الاخلاق' ہی میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔

سرسیّد نے 10 جون 1879 کے اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

''میں کل اس مسدس کو 'تہذیب الاخلاق' میں چھاپوں گا۔ اور چھے قسطوں میں اسے شائع بھی کیا۔''

اس کے شائع ہونے کے بعد سرسیّد حالی کی تحریروں کو مسلسل 'تہذیب الاخلاق' میں شائع کرتے رہے۔

'انسٹی ٹیوٹ گزٹ' اور 'تہذیب الاخلاق' سرسیّد کے انتقال کے بعد بھی محسن الملک اور وحید الدین سلیم پانی پتی کی زیرِ نگرانی پابندی سے شائع ہوتے رہے۔ اور حالی کی قلمی معاونت ان دونوں کی اشاعت میں شامل رہی۔ حالی کے اس دوران شائع ہونے والے مضامین کو انجمن ترقی اردو نے دو جلدوں میں شائع کیا۔

حالی ابتدا ہی سے 'تہذیب الاخلاق' کے مقاصد کو عام کرنے میں قلمی طور پر بھی کوشاں رہے۔ دونوں کے مقاصد میں یکسانیت اور ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً فرسودہ روایات اور توہمات کی پابندیوں سے قطع نظر جدت اور ندرت پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ نیز مغربی علوم سے استفادہ کرنے کے ساتھ عقائد کو شعوری لازمہ کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔

حالی سرسیّد کو اپنا رہنما اور مرشد تصور کرتے تھے۔ سرسیّد اور حالی میں گہری ذہنی وابستگی اور مطابقت تھی۔ حالی سرسیّد کے علی گڑھ کالج میں ملازم نہیں تھے جب کہ شبلی علی گڑھ میں استاد کے طور پر باقاعدہ ملازم تھے، اسی لیے کسی بھی گروپ فوٹو میں شبلی سرسیّد کے ساتھ بیٹھے ہوئے نظر نہیں آتے جب کہ حالی کے ساتھ سرسیّد کی متعدد تصویریں ملتی ہیں۔ اس سے سرسیّد کے خانوادے میں حالی کی عزت و عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سر راس مسعود نے 'خواجہ حالی کی دو تصویریں' کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا تھا۔ اس مضمون کو 'زمانہ' کانپور کے 'حالی نمبر' میں شائع کیا گیا۔

''سرسیّد نے حالی کے بارے میں کہا تھا کہ اگر خدا مجھ سے سوال کرے گا کہ میرے بندوں میں ایسا کون سا بندہ تجھے ملا جس کی پرستش کرنے کو تیرا دل تیار ہو جائے تو میرے پاس جواب حاضر ہوگا کہ وہ شخص الطاف حسین حالی ہے۔''

(بحوالہ علی گڑھ تحریک کی اہمیت و معنویت، صفحہ 80)

حالی کی تحریریں اور مختلف تخلیقات 'تہذیب الاخلاق' کے فروغ و ارتقا اور مسلسل اشاعت میں معاون ثابت ہوتی رہیں۔

حالی نے اپنی تحریروں، تخلیقات اور طرزِ فکر کے ذریعے عوام میں ادب و قوم کی اصلاح اور شعوری طور پر بیداری پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ وہ ہمیشہ ذہنی طور پر سرسیّد سے وابستہ رہے۔ 'حیاتِ جاوید' اس کا تحریری اور مستند ثبوت فراہم کرتا ہے۔ انھوں نے سرسیّد کے اصلاحی نظریے کو ان کے انتقال کے بعد بھی قائم رکھا۔

سرسیّد کی سوانح پر دو اہم کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ پہلی کتاب انگریز مصنف جی.ایف.آئی گراہم کی "Life and Work of Sir syed Ahmd Khan" ہے جو 1885 میں لندن میں شائع ہوئی۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس کتاب پر تبصرہ بھی شائع ہوا۔

سرسیّد پر دوسری اہم سوانح 'حیاتِ جاوید' ہے جس کو خواجہ الطاف حسین حالی نے 1901 میں شائع کیا۔ علاوہ ازیں 'یادگارِ غالب' بھی خواجہ حالی کی ایک اہم سوانح تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ کتاب 1897 میں نامی پریس کانپور سے شائع ہوئی۔ ایک کتاب سرسیّد پر اور دوسری غالب پر ان دونوں کتابوں نے حالی کو ایک عظیم سوانح نگار کی حیثیت سے اردو دنیا کے سامنے پیش کیا۔

گراہم اور حالی کی سوانح میں بعض جگہوں پر اختلافِ رائے ہے۔ مثلاً گراہم نے سرسیّد کے والد کا انتقال 1836 میں لکھا ہے۔ اس وقت سرسیّد کی عمر 9 برس تھی۔ حالی نے سیّد محمد متقی کا انتقال 1838 میں درج کیا ہے لیکن حالی کی تحریر کردہ تاریخِ وفات کو زیادہ معتبر و مستند قرار دیا گیا۔

سرسیّد کی شخصیت اور علمی امتیازات پر گذشتہ ایک صدی کے دوران بے شمار مقالات اور کتابیں اردو، انگریزی اور دیگر زبانوں میں لکھی گئیں۔ ان سب کا بنیادی ماخذ 'حیاتِ جاوید' کو قرار دیا گیا جو خواجہ الطاف حسین حالی کے حوالے سے نقل کیے جاتے رہے۔ جب کہ ''حالی کا اصل ماخذ منشی سراج الدین کا ایک غیر مطبوعہ مسودہ ہے جو اردو میں سرسیّد کی اوّلین سوانح عمری ہے۔ یہ کتاب سرسیّد کے رفیقِ کار اور ان کے خصوصی مخلص حاجی محمد اسماعیل خاں رئیس دتاولی کی ایما پر لکھی گئی تھی، اس میں سرسیّد کی خود اپنی مرضی بھی شامل تھی۔ اس مسودہ کے خالق منشی سراج الدین کا ذکر سرسیّد شناسی میں شاذ ہی کیا جاتا ہے۔''

(بحوالہ سوانح سرسیّد ایک بازدید، صفحہ 131، علی گڑھ)

منشی سراج الدین کا مسودہ شائع کیوں نہیں ہوا۔ یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ گراہم سے پہلے بھی سرسیّد کی سوانح اردو میں لکھی جا چکی تھی۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے 21 اگست 1883 کے شمارے میں سرسیّد نے اپنے اداریتی نوٹ میں لکھا تھا:

''ہمارے ایک شفیقِ غائبانہ جس نے ہم سے ملاقات ظاہر نہیں کی۔ ہماری لیف (Life) اپنے خیال کے مطابق لکھ کر ہمارے پاس بھیجی ہے جس میں ایسی باتیں بھی ہیں جس سے ہم خود بھی واقف نہیں ہیں۔ ہم ان کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔''

(بحوالہ سوانح سرسیّد ایک بازدید، صفحہ 132-131، علی گڑھ)

انگریزی میں سرسیّد کی سوانح گراہم نے 1885 میں شائع کی اس کی اشاعت کے بعد حاجی محمد اسماعیل خاں رئیس دتاولی اور دیگر رفقا نے سرسیّد کی سوانح اردو میں شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس سلسلے میں شبلی جو اس وقت 'المامون' لکھ چکے تھے، سے رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ بعد ازاں الطاف حسین حالی کو اس ضمن میں توجہ دلائی۔ حالی نے کہا کہ میں خود اس کو لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں، مگر یہ کام کب اور کیسے پایۂ تکمیل کو پہنچے گا... لیکن آخر میں حاجی محمد اسماعیل خاں کی ایما پر منشی سراج الدین اردو میں سرسیّد کی سوانح لکھنے پر رضامند ہوگئے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ علی گڑھ گزٹ، تہذیب الاخلاق کی جلدیں، سرسیّد اور ان کے دوستوں کے ذریعے مواد کی فراہمی ممکن ہو سکتی ہے۔ لہٰذا منشی سراج الدین 4/مئی 1890 کو علی گڑھ پہنچے اور ممکنہ مواد کی فراہمی کے بعد 30 جون کو اسی برس واپس ناہن کے لیے روانہ ہوگئے۔ (بحوالہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 1890)

منشی سراج الدین احمد جو سرمور گزٹ ناہن انبالہ پنجاب کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے 1893 تک یہ مسودہ غالباً مکمل کر لیا تھا۔ جب یہ مسودہ سرسیّد کی نظر سے گزرا تو انھوں نے اسے مدح نامہ تصور کیا اور اشاعت کی اجازت نہیں دی۔ سرسیّد نے اس مسودے کے بارے میں سیّد ممتاز علی کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ اس کی فی الوقت اشاعت مناسب نہیں۔ یہ مسودہ حالی کے حوالے کر دیا جائے۔ سرسیّد لکھتے ہیں:

''حاجی محمد اسماعیل خاں نے جو میری لائف منشی سراج الدین سے لکھوائی تھی، وہ مسودہ انھوں نے مولوی الطاف حسین حالی کو دے دیا ہے۔ الطاف حسین حالی بطور خود میری لائف لکھیں گے اور خود ہی چھپوائیں گے اور جو چاہیں کریں گے میں بھی اس پر راضی ہو گیا کہ مولوی الطاف حسین جو کچھ لکھیں گے چھاپا جائے۔'' (سیّد احمد 23/ستمبر 1893، صفحہ 155)

سوانح سرسیّد: ایک بازدید کے حوالے سے یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے:

''حالی نے 'حیاتِ جاوید' لکھنے کا سلسلہ جب 1895 میں شروع کیا تو ان کے پیشِ نظر کرنل گراہم کی انگریزی کتاب (1885) اور منشی سراج الدین کا مسودہ زیرِ تکمیل (1893) تھا۔ حیاتِ جاوید سرسیّد کے انتقال کے تین سال بعد یعنی 1901 میں کانپور سے شائع ہوئی تھی۔'' (صفحہ 137)

حالی کو یہ شکوہ رہا کہ سرسیّد نے اپنی سوانح سے متعلق سوالوں کا جواب نہیں دیا۔ 'حیاتِ جاوید' کے پیش لفظ میں حالی نے ان الفاظ میں اس کی وضاحت کی ہے:

...(بقیہ صفحہ 6 پر)

اردو دُنیا

اردو زبان کی ترویج ہم سب کی مشترکہ ذمے داری

چاند پاشاہ

روزنامہ سالار کے دفتر میں عملے سے ملاقات، اردو اخبار کی بقا پر زور

بنگلور (23 جنوری)۔ کرناٹک میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو اخبار روزنامہ 'سالار' کے دیرینہ رفیق شہر کے مشہور ملبوسات کے معروف شوروم کے مالک عبدالعزیز عرف چاند پاشاہ نے روزنامہ 'سالار' اخبار سے اپنی پچاس سالہ وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دینِ اسلام کا تقریباً تمام بنیادی اور علمی مواد اردو زبان میں موجود ہے، اس لیے اس زبان کو سیکھنا، سمجھنا اور فروغ دینا ہم سب کی مشترکہ ذمے داری ہے۔ 23 جنوری کو سالار گولڈن جوبلی بلڈنگ میں دفتر کے عملے سے خیر سگالی ملاقات کے بعد اخبار کے عملے سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ملک بھر میں شائع ہونے والے اردو اور دیگر اخبارات کا باقاعدہ جائزہ لیا جائے اور ہر مفید، معیاری اور معلوماتی مواد کو اپنے اخبار میں شامل کیا جائے تاکہ قارئین کو بہتر اور جامع صحافت میسر آ سکے۔ چاند پاشاہ نے نئی نسل کی اردو زبان سے بڑھتی ہوئی دوری پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے جس پر اردو داں طبقے کو فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ گذشتہ پچاس برسوں سے ان کا اس اخبار کے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے اور ان کے شوروم کے اشتہارات سال بھر بلاناغہ اخبار میں شائع ہوتے رہے ہیں، جو اردو زبان کی نصرت وحمایت کی ایک عملی کوشش ہے۔ انھوں نے دیگر اردو داں حضرات اور اداروں سے بھی اپیل کی کہ وہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور اردو اخبارات کی بقا کے لیے آگے آئیں اور اشتہارات کے ذریعے ہر ممکن تعاون کریں۔ ساتھ ہی انھوں نے اخبار کے عملے پر زور دیا کہ وہ اردو زبان کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے خلاف پوری قوت کے ساتھ آواز بلند کریں اور حکومت سے اردو کے جائز حقوق منوانے کی جدوجہد کریں۔ اس موقعے پر چاند پاشاہ نے سالار کے عملے سے ملاقات پر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ ان کے ہمراہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ عبداللہ پاشاہ بھی تھے۔ روزنامہ سالار کے اڈیٹر اسجد نواز اور منیجر علی نے معزز مہمان کی آمد پر ان کا پُرتپاک استقبال کیا اور تہنیت پیش کی۔ (سالار۔ بنگلور)

اسکولوں میں اخبار پڑھنے کے لیے اقدام کیے جائیں گے

بنگلورو (15 جنوری)۔ وزیر اعلا کے میڈیا سکریٹری کے. وی. پربھاکر نے کہا کہ حکومت اسکولوں اور کالجوں میں اخبارات کی اہم خبریں پڑھنے اور انھیں نوٹس بورڈ پر لگانا لازمی بنانے کا حکم جاری کرنے کے لیے مناسب کارروائی کرے گی۔ کرناٹک ورکنگ جرنلسٹس ایسوسی ایشن کے ریاستی صدر شیوانند تنگڈور، نائب صدر اپیچ بی مدن گوڈا اور ریاستی اخبارات ڈسٹری بیوٹرز یونین شمبھولنگا سے یادداشت قبول کرنے کے بعد پربھاکر نے اس بات کی اطلاع دی اور کہا کہ اسکولوں اور کالجوں میں اخبارات پڑھنے کے رواج کو ماضی کی طرح جاری رکھنے کے لیے کارروائی کی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ اتر پردیش حکومت نے اپنے تعلیمی اداروں میں اخبارات کو پڑھنے اور نوٹس بورڈ پر لگانے کو لازمی قرار دیا ہے، اسی طرز پر یہاں بھی لازمی قرار دینا ہوگا۔ اس سلسلے میں ماہرین سے تبادلہ خیال کر کے کارروائی کرنے کا انھوں نے یقین دلایا۔

(سالار۔ بنگلورو)

کتاب میلوں میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی علمی وادبی خدمات

شائقینِ ادب نے سراہا، 459225 روپے کی کتابیں فروخت

انجمن ترقی اردو (ہند) 1903 میں قائم ہونے والا ایک قوم پرست ادبی ادارہ ہے، جس نے اردو زبان وادب کے فروغ اور معیاری کتب کی اشاعت کو اپنی ترجیحات میں شامل کیا ہے۔ انجمن کے بنیادی مقاصد میں یہ بات بھی ہمیشہ شامل رہی ہے کہ اپنی اشاعتیں عام قارئین، طلبہ اور اہلِ علم تک براہِ راست پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے، آج کے اس برقی دور میں بھی جب کہ انجمن کی تمام مطبوعات آن لائن پلیٹ فارم مثلاً امیزون وغیرہ پر بہ آسانی دستیاب ہیں۔

اس برس انجمن نے ہندستان کے مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے اہم کتاب میلوں میں شرکت کی اور اپنی کلاسکل اور جدید مطبوعات کو براہِ راست قارئین تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ اس سلسلے کی ابتدا کشمیر میں منعقد ہونے والے 'چنار بک فیسٹول' سے ہوئی، چنار بک فیسٹول قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے اشتراک سے 2 تا 10 دسمبر 2025، سری نگر، کشمیر میں منعقد کیا تھا۔ وادیِ کشمیر کے باذوق قارئین نے انجمن کی مطبوعات میں خاصی دلچسپی دکھائی اور پسندیدگی کا اظہار کیا۔ طلبہ، اساتذہ، رسرچ اسکولر اور عام شائقینِ ادب نے بھی اپنی اپنی ضرورت کے مطابق کتابیں خریدیں۔ بعض قارئین نے انجمن کی اشاعتی پالیسی اور معیاری طباعت کو سراہا اور مستقبل میں مزید نئے موضوعات پر تحقیقی وتنقیدی کتب کی اشاعت کی خواہش بھی ظاہر کی۔

دوسرا کتاب میلہ 22 تا 30 نومبر 2025 علی گڑھ میں منعقد کیا گیا۔ علی گڑھ کے عوام اور خصوصاً علمی حلقوں نے اس میلے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ علی گڑھ جیسے تاریخی وتہذیبی شہر میں اس کتاب میلے کے انعقاد نے ایک نئی ادبی توانائی پیدا کی، انجمن کے اسٹال پر خاصی بھیڑ تھی، جنھوں نے اردو کی نصابی کتابوں کے علاوہ، تحقیق، تنقید، سوانح، تاریخ، شاعری اور کلاسکی ادب پر لکھی گئی کتابوں کو خریدنے میں بے حد دلچسپی دکھائی۔ علی گڑھ میں کتاب دوستی کا اچھا تجربہ رہا، یہاں کتابیں خریدنے کا ذوق ابھی زندہ ہے اور بڑی محبت کے ساتھ زندہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میلے میں شرکت کرنے والوں کی تقریباً ایک کروڑ روپے سے زیادہ کی اردو کتابیں فروخت ہوئیں۔ علی گڑھ میں انجمن کے اسٹال سے تاریخ اور اردو ادب سے متعلق کتابیں سب سے زیادہ فروخت ہوئیں۔ اس میلے میں نوجوان طبقے کی دلچسپی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، یہ بھی اندازہ ہوا کہ نئی نسل اردو کتابوں سے اپنا تعلق مضبوط بنانا چاہتی ہے۔ آئندہ بھی کتاب دوستی سے ان کی اس لگن کی قدر کی جانی چاہیے۔

اورنگ آباد میں منعقد ہونے والے 14 تا 21 دسمبر 'اورنگ آباد تعلیمی وکتابی میلہ 2025' میں بھی انجمن کی مطبوعات پیش کی گئیں۔ اس میلے میں تعلیمی اداروں سے وابستہ افراد کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ انجمن کی کتابوں کو یہاں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اساتذہ نے تحقیقی وتدریسی نوعیت کی کتابوں میں خاص دلچسپی ظاہر کی اور بعض اداروں نے لائبریریوں کے لیے بھی کتابیں خریدیں۔ مہاراشٹرا وقف بورڈ کے ریاستی ڈپٹی سی ای او محترم مشیر احمد شیخ کے علاوہ بھی علاقے کی بڑی شخصیات نے میلے میں انجمن کی شرکت کو تحسین کی نظر سے دیکھا۔ اورنگ آباد میں مولوی عبدالحق کے چاہنے والوں کی بڑی تعداد دیکھنے کو ملی جنھوں نے ان کی کتابیں اور ڈکشنری خاصی تعداد میں خریدیں، دراصل انجمن کا صدر دفتر ایک زمانے تک اورنگ آباد میں بھی رہا ہے۔ اورنگ آباد کے نوجوان طبقے خصوصاً خواتین میں ناول پڑھنے کا رواج بہت زیادہ دیکھنے کو ملا، انجمن سے شائع ہونے والے گیتا نجلی شری کے ناول کا اردو ترجمہ 'ریت سمادھی'، اسامہ صدیق کا اردو ناول 'غروبِ شہر کا وقت' اور دیگر بہت سے سنجیدہ ناول نگاروں کے ناولوں کو لوگوں نے خوب سراہا۔ اسی طرح وہاں کے بعض خانقاہی اداروں سے وابستہ افراد نے تاریخ وتصوف کی کتابیں خریدیں جن میں 'مقالات نظامی' اور پرفیسر شریف حسین قاسمی کی 'مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ' سرِفہرست ہیں۔

اسی طرح کلکتہ میں مغربی بنگال اردو اکادمی کی جانب سے '18 واں کل ہند اردو کتاب میلہ 2026' میں بھی انجمن نے اپنا اسٹال لگایا، یہاں مغربی بنگال اردو اکادمی کے علاوہ وہاں کے اہلِ علم حضرات نے خاصی تعداد میں کتابیں خریدیں، انجمن کا ہفت روزہ اخبار 'ہماری زبان' کے مغربی بنگال نمبر کی دوسو سے زائد کاپیاں مفت تقسیم کی گئیں، جب کہ سہ ماہی 'اردو ادب' کے تازہ شمارے بھی بڑی تعداد میں خریدے گئے۔

مختلف شہروں کے علاوہ دہلی میں منعقد ہونے والے مختلف پروگراموں اور کتاب میلوں میں انجمن نے نمایاں طور پر شرکت کی۔

ایوانِ غالب، دہلی میں منعقد ہونے والے سالانہ 'اردو بک فیسٹول 2025' میں بھی انجمن کی شرکت قابل ذکر ہے۔ دہلی اپنی علمی وادبی روایت، جامعات، تحقیقی مراکز اور بے شمار اشاعتی اداروں کی موجودگی کے باعث گویا کتابوں کا شہر ہے۔ یہاں قاری کے پاس انتخاب کے وسیع امکانات ہوتے ہیں اور مسابقت بھی فطری طور پر زیادہ ہوتی ہے۔ ایسے ماحول میں بھی انجمن ترقی اردو (ہند) کا اپنے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے نمایاں تعداد میں کتابوں کی فروخت کرنا اس کے اشاعتی وقار اور قارئین کے اعتماد کی واضح دلیل ہے۔ انجمن کی اشاعتی پالیسی ہمیشہ سنجیدہ رہی ہے۔ مواد کے انتخاب میں احتیاط، علمی معیار کی پابندی، مستند حوالوں کا پورا خیال اور طباعت کی عمدگی شناخت بن چکی ہے۔ انجمن ہر چند وہی کتب شائع کرتی ہے جو موضوع کے اعتبار سے کسی خلا کو پر کرنے والی منفرد، علمی لحاظ سے مستند، معتبر اور اسلوب کے اعتبار سے دلچسپ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی کے اس اہم کتابی میلے میں بھی انجمن کا اسٹال علمی حلقوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا اور بڑی تعداد میں کتابوں کی فروخت اس اعتماد کی توثیق کرتی رہی جو اہلِ علم کو انجمن کی اشاعتوں پر برسوں سے حاصل ہے۔

پرگتی میدان، نئی دہلی میں منعقد ہونے والا دنیا کا سب سے بڑا ادبی میلہ 'نئی دہلی ورلڈ بک فیئر 2026' اپنی وسعت اور عوام کی غیر معمولی توجہ کے اعتبار سے ملک کا سب سے بڑا کتابی میلہ شمار ہوتا ہے۔ ایسے ہمہ گیر اور بین الاقوامی نوعیت کے میلے میں بھی انجمن ترقی اردو (ہند) کی شرکت اپنے اشاعتی عزم میں مضبوط منصوبہ بندی کی علامت ہے۔ اگرچہ انجمن کا صدر دفتر دہلی ہی میں قائم ہے، اس کے باوجود انجمن نے اپنے ذاتی وسائل اور خطیر مصارف جو لاکھوں روپے تک پہنچتے ہیں، صرف کرتے ہوئے اس میلے میں شرکت کو یقینی بنایا، تاکہ دنیا بھر سے آنے والے قارئین، محققین، مترجمین اور اشاعتی نمائندگان تک اپنی معیاری مطبوعات کو براہِ راست پہنچا سکے۔

ورلڈ بک فیئر میں دیگر تمام میلوں کی بہ نسبت غیر معمولی ہجوم دیکھنے کو ملا۔ مختلف ریاستوں کے علاوہ بیرونِ ملک سے آنے والے شائقینِ کتب نے بھی انجمن کے اسٹال کا رخ کیا۔ یہاں سنجیدہ قارئین نے بڑی دل چسپی کے ساتھ کتابوں کا مطالعہ کیا، موضوعات کے بارے میں استفسار کیے اور بڑی تعداد میں کتابیں خریدیں۔

سال بھر کے ان کتابی میلوں میں اس طرح شرکت سے انجمن نے اس بات کا قریبی مشاہدہ کیا ہے کہ اردو کے سنجیدہ قارئین آج بھی موجود ہیں۔ بس اردو کا قاری معیاری اور منفرد مواد کا متلاشی ہے اور جب اسے نکھرا ہوا، تحقیقی اور فنی سلیقے کے ساتھ پیش کیا جائے تو وہ اس کی قدر بھی کرتا ہے۔ انجمن کے پاس اس وقت تقریباً ڈھائی سو ٹائٹل موجود ہیں جنھیں کتابی میلوں میں قارئین کے لیے سجایا گیا، ہر چند اپنی گراں قدر رقیمتوں کے سبب انجمن کے کئی ٹائٹل ختم بھی ہو گئے جن میں 'مقالات نظامی' کا سیٹ اس لیے قابلِ ذکر ہے کہ وہ چھے جلدوں پر مشتمل تھا جس کی کل قیمت 4500 روپے تھی۔ اسی طرح اردو املا نمبر، غروب شہر کا وقت، دلی والوں کی تحریریں، ذکرِ میر (میر کی خودنوشت سوانح) اور دیگر کتابیں شامل ہیں جو کتابی میلوں میں خوب خریدی گئیں۔ اس دوران فروخت ہونے والی کتابوں کی اصل قیمت 771482 روپے ہے جب کہ رعایت کے بعد 459225 روپے کی انجمن کی کتابیں فروخت ہوئی ہیں۔ انجمن نے ہمیشہ اسی اصول کو پیشِ نظر رکھا ہے کہ اشاعت کا معیار، موضوع کا اپنا وقار اور طباعت کا حسن ہمیشہ اعلا ترین رہے اور کتاب ہر قاری تک پہنچے۔

نئی نسل کے تخلیقی بیانیے سے اردو ادب کا مستقبل روشن

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

نئی دہلی (9 فروری)۔ اکیسویں صدی میں ادبی رجحانات محض اسلوبی یا فنی تبدیلیوں تک محدود نہیں رہے، بلکہ انھوں نے فکری، سماجی اور تہذیبی سطح پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ عصرِ حاضر میں انفارمیشن ٹیکنالوجی، عالمگیریت، ڈیجیٹل ذرائع، سماجی تغیرات اور نئی فکری تحریکوں نے ادب کو ایک نئے تناظر سے روشناس کرایا ہے، جہاں روایت اور جدت کے درمیان ایک بامعنی مکالمہ قائم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ایسے میں ادبی رجحانات کا تجزیہ نہ صرف موجودہ ادبی صورتِ حال کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے بلکہ مستقبل کی سمتوں اور امکانات کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ اسی فکری پس منظر میں اردو اکادمی، دہلی کے زیرِ اہتمام قومی سمینار 'اکیسویں صدی میں ادبی رجحانات: تجزیہ اور امکانات' کے تیسرے اور آخری دن دو اہم علمی اجلاس منعقد ہوئے، جن میں معاصر اردو ادب کے فکری، سماجی اور ثقافتی پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی گئی۔

تیسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت جناب سیّد ابوذر ہاشمی، پروفیسر شہاب عنایت ملک اور پروفیسر مشتاق احمد نے مشترکہ طور پر کی، جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نثار احمد خاں نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں اردو ادب کے عصری مسائل اور رجحانات پر مختلف زاویوں سے مقالات پیش کیے گئے۔ مقالہ نگاروں میں پروفیسر صفدر امام قادری، ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر ابوبکر عباد، ڈاکٹر احسن ایوبی اور ڈاکٹر جگدم بابو دوبے شامل تھے۔ پیش کیے گئے مقالات میں اکیسویں صدی میں اردو ادب کے فکری و جمالیاتی رجحانات، غزل کی روایت اور عصری تقاضے، ماحولیاتی ادب اور اردو فکشن، ترجمہ نگاری اور بین الثقافتی مکالمہ، نیز دلت، اقلیتی اور پس ماندہ طبقات کے ادبی اظہار جیسے اہم موضوعات زیرِ بحث آئے۔

اینگلو عربک پرائمری اسکول ترکمان گیٹ میں سالانہ جلسہ و تقریبِ تقسیمِ انعامات

نئی دہلی (یکم فروری)۔ اینگلو عربک پرائمری اسکول ترکمان گیٹ کا سالانہ جلسہ اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی میں یکم فروری کو صبح 9:30 بجے منعقد ہوا۔ جلسے کا آغاز اسکول کی پرنسپل محترمہ سلطانہ نے کیا۔ اس جلسے میں اسکول کے 260 طلبہ و طالبات نے اپنی شاندار کارکردگی کے جوہر دکھائے۔ اس پروگرام میں درجہ نرسری سے پنجم تک کے بچوں نے تلاوتِ کلام پاک، حمد، نعتیں، نظمیں، انگریزی اور اردو میں تقاریر، ڈرامے، فینسی لباس زیب تن کر کے مشاعرے اور قوالی جیسے پروگراموں میں حصہ لیا۔ اس پروگرام کے مہمانِ خصوصی سراج الدین قریشی (چیئرمین کم مینجنگ ڈائرکٹر آف ہند گروپ آف انڈسٹریز) تھے۔ انھوں نے بچوں کی پیش کش کو سراہتے ہوئے کہا کہ والدین اور اساتذہ بچوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو پہچان کر انھیں نکھاریں اور ان میں خود اعتمادی پیدا کریں۔ مہمانِ خصوصی اور سوسائٹی کے ممبران نے تعلیمی سال 2025 میں اول، دوم اور سوم پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات، نیز آج کے جلسے میں بہترین کارکردگی کے لیے اول، دوم اور سوم انعامات اور ان کے علاوہ 17 توصیفی انعامات مختلف درجات کے طلبہ و طالبات میں تقسیم کیے۔ اس کے علاوہ رواں سال کی اسکول انتظامیہ کمیٹی اور پرنسپل نے بچوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کے لیے توصیفی ایوارڈ کا بھی آغاز کیا۔ اسکول کے صدر اور مینجنگ کمیٹی نے پروگرام کے لیے اپنی نیک خواہشات اور دعائیں دیں۔ منیجر پروفیسر مظہر احمد نے مہمانوں، پرنسپل اور جملہ اسٹاف کا شکریہ ادا کیا۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

ترقی پسند تحریک کا ادب میں اہم کردار

میرٹھ (31 جنوری)۔ 1932 میں 'انگارے' کی اشاعت کے بعد سے ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس تحریک کے روحِ رواں سجاد ظہیر اور ان کے ساتھی تھے۔ 1936 کے اجلاس میں پریم چند نے بھی شرکت کی تھی۔ آج آپ ڈیجیٹل دور میں لکھ رہے ہیں اور مقصد بنا کر لکھ رہے ہیں تو آپ ترقی پسند مانے جائیں گے۔ ان خیالات کا اظہار معروف ناقد و شاعر امیر مہدی [انگلینڈ] نے، آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام منعقد 'ترقی پسند تحریک پر ایک گفتگو' موضوع پر اپنی تقریر کے دوران کیا۔

اس دوران مختلف سوالوں کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اگر آپ بامقصد اور سماج کی بہتری کے لیے کچھ لکھ رہے ہیں تو آپ ترقی پسند مانے جائیں گے۔ یہ تحریک اشتراکیت سے جڑا ایک سچ ہے جب تک یہ دنیا رہے گی ترقی پسندی برقرار رہے گی۔ میں جدیدیت کا قائل نہیں ہوں کیوں کہ یہ رہنے والی نہیں ہے مگر ترقی پسند تحریک ہمیشہ رہنے والی تحریک ہے۔ ترقی پسند تحریک کا مقصد یہ تھا کہ کوئی کسی کا غلام نہ رہے اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ دوسرے ادب اور تحریک میں وہ اثر نہیں ہے جو ترقی پسند تحریک میں ہے۔ جو چیزیں ترقی کے لیے لکھی جائیں گی وہ رہ جائیں گی لیکن جن کا تعلق ترقی پسندی سے نہیں ہوگا وہ ختم ہو جائیں گی۔ ہمارے معاشرے پر جتنا اثر ترقی پسند تحریک نے ڈالا اتنا کسی اور تحریک نے نہیں ڈالا۔ اگر ہمارے کاموں میں حسن نہیں ہے اور ہم اپنے مقصد کو سامنے رکھ کر کام نہیں کر رہے ہیں تو ہم ترقی پسند نہیں ہو سکتے مگر جو وقت کی ضرورت کے مطابق کام کر رہے ہیں اور ترقی کر رہے ہیں، ضرورتوں کو پورا کر رہے ہیں تو ہم ترقی پسندوں میں شامل ہوں گے۔ اگر آپ بامقصد ادب لکھ رہے ہیں اور ترقی پسند ذہن کے ذریعے سماج میں بھلائی کا کام کر رہے ہیں تو آپ کی تحریریں انقلابی تحریک کا حصہ بن سکتی ہے۔

پریم چند اور منٹو بھی ترقی پسند ہیں کیوں کہ انھوں نے ضرورت کے مطابق لکھا ہے۔ انھوں نے اس دوران اپنے ناول 'ٹیریرسٹ' پر بھی تفصیلی گفتگو کی۔ اس سے قبل پروگرام کا آغاز محمد ندیم نے تلاوتِ کلام پاک سے کیا۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر معروف ناقد و شاعر امیر مہدی (انگلینڈ) نے شرکت کی۔ لکھنؤ سے آیوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین موجود تھیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے انجام دیے۔ پروگرام میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ترقی پسند تحریک اپنے آپ میں ایک انقلاب ہے۔ یہ تحریک ایک تنظیم تھی جس نے لوگوں کو آگے بڑھانے کا کام کیا۔ یہ تحریک جو 1936 سے شروع ہوئی، اس نے اردو میں ایک انقلابی قدم اٹھایا اور پریم چند جیسے ادیب اس تحریک میں شامل تھے۔ اس تحریک کے اثرات نے ناول، افسانے، نظم وغیرہ قبول کیے۔

پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ یہ سچ ہے کہ ترقی پسند تحریک بڑی تحریک تھی جس نے ادب میں اپنا خاص رول ادا کیا، لیکن دیگر تحریکوں نے بھی ادب میں اپنا اہم کردار ادا کیا ہے اور جو ادب لکھا جائے گا اُس میں بھی ترقی پسندی کے اثرات نظر آئیں گے۔ میں پروگرام سے اس لیے بھی خوش ہوں کہ ترقی پسند تحریک سے متعلق بہت سی نئی چیزیں سننے کو ملیں۔ ہمارے اسکالر کے لیے یہ پروگرام ایک یادگاری پروگرام رہے گا۔ اس موقعے پر پروفیسر ریشما پروین، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، علمہ نصیب، سیّدہ مریم الٰہی، عظمیٰ مہدی وغیرہ نے ترقی پسند تحریک سے متعلق مختلف سوالات کیے جن کے امیر مہدی نے مفصل جوابات دیے۔ (سچ کی آواز۔ دہلی)

ڈاکٹر تابش مہدی کی یاد میں

محفلِ نعت کا انعقاد

نئی دہلی (پریس ریلیز، 7 فروری) معروف ادیب، نقاد اور شاعر ڈاکٹر تابش مہدی کی وفات کو ایک سال ہونے پر اُن کے تلامذہ و منتسبین پر مشتمل ادبی تنظیم بزمِ تابش کی جانب سے ایک باوقار محفل نعت کا انعقاد کیا گیا۔ نشست کی صدارت ملک کے معروف عالم دین اور ملّی رہنما مولانا محمد طاہر مدنی نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں ڈاکٹر تابش مہدی کے ساتھ نصف صدی پر محیط اپنے روابط کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک شخصیت ساز انسان تھے۔ میرے شعری سفر کو پروان چڑھانے میں بھی اُن کی رفاقت کا بڑا دخل رہا ہے۔ وہ ایک ماہر قاری اور بڑے ادیب و نقاد بھی تھے۔ انھوں نے ایک طرف بے شمار لوگوں کو فن قرأت سے آراستہ کیا تو دوسری طرف نعت گوئی کا سلیقہ سکھایا۔ ان شاء اللہ یہ سب چیزیں ان کے لیے رفع درجات کا باعث ہوں گی۔

اس مناسبت سے ایک محفلِ نعت منعقد کی گئی، جس میں: طاہر مدنی، حسنین سائر، واحد نظیر، راشد حامدی، منور حسن کمال، خالد عمری، تنویر آفاقی، ضمیر اعظمی، نورالعین قیصر، اسرار رازی، رنگ نگینوی، اظہر شہاب، کاظم بجنوری، حامد علی اختر، نسیم مجیدی، منصور ذکی اور اجمل فاروق ندوی نے نکہت و نور میں ڈوبے ہوئے اپنے کلام سے نوازا۔

آخر میں بزم تابش کے سکریٹری نسیم مجیدی نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض شاہ اجمل فاروق ندوی نے خوش اسلوبی سے انجام دیے۔

آگرہ میں علامہ شبلی نعمانی پر فکری سمینار

آگرہ (یکم فروری)۔ اردو ادب کی فکری وراثت، تحقیقی شعور اور تنقیدی روایت کو فروغ دینے کے مقصد سے انجمن اصلاح اللسان ویلفیئر سوسائٹی (رجسٹرڈ)، آگرہ کے زیرِ اہتمام اور اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ (حکومتِ اتر پردیش) کے مالی تعاون سے ایک روزہ سمینار بعنوان 'علامہ شبلی نعمانی اور اردو ادب' ایم اے بی آر سیکنڈری اسکول، پرکاش نگر، آگرہ میں منعقد کیا گیا۔ سمینار میں اہلِ علم، اساتذہ، طلبہ اور ادبی شخصیات کی بڑی تعداد نے شرکت کی اور علامہ شبلی نعمانی کی ہمہ جہت خدمات پر تفصیلی گفتگو کی گئی۔ سمینار میں مقررین نے اس بات پر زور دیا کہ علامہ شبلی نعمانی نہ صرف اردو ادب کے عظیم مفکر اور مورخ تھے بلکہ انھوں نے قوم کی فکری و تعلیمی رہنمائی میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی تحریروں میں تحقیق، استدلال اور تاریخی شعور کی جو گہرائی پائی جاتی ہے وہ آج بھی اہلِ علم کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ صدرِ جلسہ مفتی محمد عمران قریشی (مفتیِ شہر آگرہ) نے کہا کہ علامہ شبلی نعمانی نے اردو ادب کو مضبوط تحقیقی بنیاد فراہم کی اور علمی دیانت کو فروغ دیا۔ انھوں نے کہا کہ شبلی کی فکر میں اعتدال، وسعتِ نظر اور تہذیبی شعور نمایاں ہے، جس کی آج کے دور میں شدید ضرورت ہے۔ مہمانِ خصوصی حاجی جمیل الدین قریشی (سابق پرنسپل محمدیہ انٹر کالج، آگرہ) نے کہا کہ شبلی نعمانی کی تصانیف آج بھی طلبہ اور محققین کے لیے رہنمائی کا ذریعہ ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ نئی نسل کو شبلی کی فکری خدمات سے روشناس کرانا وقت کا تقاضا ہے تاکہ علمی اور اخلاقی اقدار کو مضبوط کیا جا سکے۔ خصوصی مہمان ڈاکٹر سعدیہ شمسی (اسسٹنٹ پروفیسر سینٹ جانس کالج، آگرہ) نے علامہ شبلی نعمانی کو جدید اردو تنقید کا بنیادی ستون قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کی علمی بصیرت نے اردو ادب کو عالمی سطح پر وقار بخشا۔ انھوں نے کہا کہ شبلی کی تحریروں میں فکری جرأت اور تنقیدی توازن نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ معزز مہمان اور اردو صحافی اظہر عمری نے کہا کہ علامہ شبلی نعمانی نے اردو کو سماجی ذمے داری سے ...(بقیہ صفحہ 7 پر)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : دشتِ جنوں (مجموعۂ غزلیات)
شاعر : ڈاکٹر فداء المصطفیٰ فدوی)
اشاعت : 2024
ضخامت : 180 صفحات
قیمت : 250 روپے
ناشر : الفاظ پبلی کیشن، پھٹانا اولی، کامٹی-441001
تبصرہ نگار : غلام السیّدین

E-mail:drgskhwaja@gmail.com
Mob. No. +91 72767 63570

ڈاکٹر فداء المصطفیٰ فدوی کے اِس اولین شعری مجموعے میں ایک حمد، دو نعتیں، 70 غزلیں، 12 تاثراتی نظمیں اور پانچ قطعات شامل ہیں۔ وہ اس تصنیف سے قبل احتشام حسین کی حیات وفن پر ایک سنجیدہ تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں 1985 میں شائع کر چکے ہیں۔

اپنی غزلوں میں جدید شاعری کی اصطلاحات اور علامتوں کو فدوی نے بھی خوب اپنایا۔

شاعری میں وہ قدیم اور جدید کے اختلاف کو بے وجہ سمجھتے ہیں۔ وہ نمائندگی تو جدید شعرا کی کرتے ہیں لیکن روایتی رنگ کے بہت خوب صورت شعر بھی کہتے ہیں۔ فارسی اور اردو کے کلاسکی ادب کا اُستاد طلبہ کو پڑھاتے پڑھاتے اُس رنگ سے اچھوتا کیسے رہ سکتا تھا۔ اِس دعوے کی دلیل، یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

ابھی اِس آئینے کو سادہ و شفاف رہنے دو
نہ لے جاؤ دلِ ناداں کو ارمانوں کی دنیا میں

غزل کی صنف کا یہ کمال ہے کہ محظوفات اور ابہام کا پردہ رکھ کر بہت بلیغ بات اِس میں کہی جاسکتی ہے۔ پروفیسر فدوی در پردہ بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ کہتے ہیں:

سوکھے رہے ساون میں نہ بھادوں ہی میں بھیگے
ہوں جس میں نہال، ایسا مہینہ نہیں آیا
عجب طلسمِ تغافل تھا مجھ پہ سایہ فگن
وہ میرے سامنے ہوکر مری نظر میں نہ تھا

اُن کے اشعار میں بھی سوختہ دلی، افسردگی، دل گرفتگی، خوشی کے در پردہ غم کی لہر، جیسے جذبات اُن کے اشعار میں ملتے ہیں۔ اِس انداز کے کچھ اشعار دیکھیں:

کوئی طائر جب سرِ شاخِ صنوبر گائے گا
ٹوٹ کر بیتا ہوا موسم تمھیں یاد آئے گا
فصلِ گل میں یادِ یارِ مہرباں تڑپائے گی
تن بدن میں آگ کا دریا سا اِک لہرائے گا

ڈاکٹر فدوی کا دکھا ہوا دل اور اُن کے شعروں میں جھلکتا غم اُنھیں میر کے شعروں کی یاسیت سے قریب کرتا ہے۔ اِس رنگ کے کچھ شعر ملاحظہ فرمائیں:

اک نوحہ گر نے اب اُسے مسکن بنا لیا
رہتا تھا اِس مکان میں جو نغمہ گر، گیا
روشن تھی چشم، شاد تھا دل جس کی دید سے
ویران اب وہ کوچۂ دل دار ہوگیا

'دشتِ جنوں' کا شاعر فارسی زبان پر اچھی دست رس رکھتا ہے۔ پروفیسر فدوی نے بھی اپنے اشعار میں فارسی اصطلاحات سے معنویت پیدا کی ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ فدوی نئی غزل کے نمائندہ شاعر ہیں اور جدید لہجہ اُن کا مسلک ہے۔ ندرتِ خیال بھی، اُن کے اشعار کا ایک وصف ہے۔ سہل ممتنع میں وہ بہت اچھی غزلیں کہتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

خاموشی، آواز نما ہے
سنّاٹا کچھ بول رہا ہے
کیا جنگل کی تاریکی میں
کوئی اُجالا راہ نما ہے
نفس کی آمد و شُد کا شمار باقی ہے
نگارِ زیست ترا اعتبار باقی ہے
کیا ہم کو دیا شام نے، کیا دے گا سویرا
ہوگا نہ کبھی ختم، یہ دن رات کا پھیرا

عرفان صدیقی اور افتخار عارف نے غزل میں کربلا کے حوالوں سے استفادہ کر کے مضامین میں خوب بلاغت پیدا کی۔ اِس مزاج کا ایک شعر، فدوی کے مجموعے سے دیکھیں:

فوجِ باطل کو بھلا، تابِ نظارہ تھی کہاں
آنکھیں خیرہ تھیں ہزاروں کی، بہتّر چمکے

فدوی عامیانہ تغزل سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ لیکن اِس سے کبھی انکار بھی نہیں کیا کہ اُن کے دل میں محبت کی ایک آگ روشن ہے۔ وہ تغزل کو اِس شانِ خفا سے برتتے ہیں کہ ابتلا اور دردِ دل کی آنچ باہر سے دکھائی نہیں دیتی بلکہ وہ عود کی طرح اندر اندر سلگتی سی لگتی ہے۔ وارداتی شاعری کے کچھ نمونے دیکھیں۔ کہتے ہیں:

متاعِ دل تو تمھیں نذر کر چکے جاناں
اب اپنے دل پہ کہاں اختیار باقی ہے
تعلق ٹوٹنے پر آ گیا اب جسم سے جاں کا
فسوں گر کب تجھے جادو جگانے کا خیال آیا

ڈاکٹر فدوی اپنی غزل میں تغزل کا پُٹ بہت مہارت سے برتتے ہیں۔ قاری ذرا غور کرنے کے بعد ہی اُس تک پہنچتا ہے، اور یہ ایکس پلوریشن اُسے ایک کہانی بننے پر اُکساتا ہے۔ کہانی میں محبوبیت کا عنصر ایک رومانی فضا پیدا کرتا ہے، یہی عنصر شعر کو دل آویز بناتا ہے۔ ایسی ہی ایک غزل کا مطلع ملاحظہ فرمائیں:

اِک رات کو مہمان تھا ٹھہرایا ہوا چاند
کچھ منھ سے وہ کہتا نہ تھا شرمایا ہوا چاند

اِس مجموعے میں ڈاکٹر فدوی نے دو غزلیں ہندی زبان میں بھی لکھی ہیں۔ اُس تجربے میں بھی وہ کامیاب ہیں۔

فدوی کی نظمیں بھی بہت تاثر انگیز ہیں۔ نظم 'مجبوری' بھی ایک تاثر انگیز نظم ہے۔ یہ نظم اپنے مشمولات کے اعتبار سے مصری شاعر خلیل جبران کی نظم 'پروفیٹ' کی طرح ہے۔ نظم 'پروفیٹ' میں برسوں بعد آنے والا جہاز مجبور مسافر کو ساتھ لیے بغیر واپس چلا جاتا ہے لیکن نظم 'مجبوری' میں جہاز ڈوب جاتا ہے۔ دونوں نظموں میں تنہا اور مجبور مسافر کی مصیبت یکساں ہے۔

ڈاکٹر فدوی کے اِس شعری مجموعے میں اُن کے قلم کی تخلیق، پانچ قطعات بھی ہیں۔ عموماً قطعات نظم کا ایک چھوٹا حصہ ہوتے ہیں لیکن فدوی کے قطعات، غزل پارے ہیں۔

ڈاکٹر فدوی نے اپنی شاعری سے ادب نوازوں کو چونکا دیا ہے۔ اُن کے اشعار کو سمجھ کر ایک مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کا یہ شعری مجموعہ ودربھ کی شعری روایات میں ایک اضافے کے طور پر دیکھا جائے گا۔ مجھے امید ہے سنجیدہ ادب کا ذوق رکھنے والے اُن کی شاعری کو ضرور پسند کریں گے۔ ◆◆

حالی اور سرسیّد (بقیہ صفحہ 3 سے آگے)

''راقم کو سرسیّد کی زندگی کے حالات لکھنے کا خیال پہلے پہل اس وقت پیدا ہوا تھا جب وہ اپنے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ مفید کام کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ مدرسۃ العلوم قائم ہو چکا تھا اور باوجود سخت مخالفت کے بہت تیزی سے ترقی کرتا جا رہا تھا۔ میرے دل میں ان کی وقعت روز بروز زیادہ ہونے لگی تھی۔ اس وقت سے میں نے کچھ نوٹ ان کی لائف کے بارے میں قلم بند کرنے شروع کیے تھے اور کم و بیش سو سوال ایک کاپی میں لکھ کر سرسیّد کے پاس بمقام علی گڑھ اس غرض سے بھیجے کہ ان کا جواب مختصر طور پر لکھ دیں مگر وہ کاپی یوں ہی پڑی رہی، اس سوال کا جواب وہاں نہ ملا۔ میں نے یہ بھی چاہا کہ برس چھے مہینے خود علی گڑھ میں جا کر رہوں، جہاں اس کام کے لیے قیام نہایت ضروری تھا مگر ملازمت کے تعلق کی وجہ سے یہ موقع بھی نہ مل سکا۔ بعض صاحبوں کی رائے ہوئی کہ سرسیّد کی زندگی میں ان کی لائف لکھنی مناسب نہیں، اس کی جو وجوہات انھوں نے اس وقت بیان کیں وہ مجھے بھی معقول معلوم ہوئیں۔ ان اسباب سے آخر کار یہ ارادہ موقوف کیا۔''

(حیاتِ جاوید، الطاف حسین حالی، محمد رحمت اللہ رعد، نامی پریس، کانپور 1901)

نتیجے کے طور پر سرسیّد کی وفات کے بعد 1901 میں 'حیاتِ جاوید' کی اشاعت عمل میں آئی لیکن سرسیّد اپنی سوانح کی تصنیف و اشاعت خواجہ الطاف حسین حالی کے ذریعے ہی کروانا چاہتے تھے۔ غالباً وہ حالی کی طرزِ تحریر اور طرزِ تصنیف سے کسی حد تک متاثر ضرور رہے ہوں گے۔

حالی کی زندگی اور سیرت پر یہاں دو اہم کتابوں کا ذکر کرتے چلیں۔ 'حیاتِ حالی' مرتبہ سیّد محمد فاروق اس کتاب کی اشاعت لاہور میں ہوئی۔

'یادگارِ حالی'، صالحہ عابد حسین کی تصنیف ہے جو خواجہ الطاف حسین حالی کی نواسی ہیں۔ اس کتاب کا پیش لفظ مولانا ابوالکلام آزاد نے تحریر کیا تھا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی نے 1986 میں پانچواں ایڈیشن شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں صالحہ عابد حسین نے سیرت و سوانح اور ان کی زندگی کے حالات و کوائف کو نہایت جامع اور معتبر حوالوں کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ اس کتاب کے آٹھ ایڈیشن منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

'یادگارِ حالی' سے جستہ جستہ چند جملے ہم یہاں صالحہ عابد حسین کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں:

اٹھارہ برس کی عمر میں حالی نے عربی میں ایک کتاب لکھی۔ یہ ان کی پہلی تصنیف تھی لیکن ان کے استاد نے اوراق کو چاک کر کے ضائع کر دیا۔

ابتدا میں مذہبی رنگ کافی گاڑھا تھا لیکن سرسیّد کے اثر سے روشن خیالی میں تبدیل ہو گیا۔ شیفتہ سے گہرے تعلقات رہے۔

حالی ہریانہ کے حصار میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازم تھے۔ غدر کی وجہ سے پانی پت کے لیے روانگی اختیار کی۔

بزرگوں کے دباؤ میں محض پندرہ برس کی عمر میں شادی کی۔

حالی کی اہلیہ شیعہ تھیں اور وہ خود سنّی عقیدے سے تعلق رکھتے تھے۔

سرسیّد کی کوششوں سے حالی کو ریاست حیدرآباد سے وظیفہ ملا۔

حالی کو خطاب ملا تو انھیں الجھن محسوس ہوئی کیوں کہ سرکاری پروگراموں میں حاکموں کی پذیرائی کرنا پڑتی تھی۔

زندگی کے تقریباً تیس برس مختلف جگہوں پر ملازمت کے لیے گزرے جو محض خاندان کی کفالت کے لیے تھے۔

کھانے سے زیادہ دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے۔

اگر کسی کی بات نامناسب ہو تو بڑی محبت اور نرمی سے سمجھاتے تھے۔

جہاں جاتے وہاں سے کھانے کی چیزیں ضرور لے کر آتے اورخاندان بھرمیں تقسیم کرتے۔

ہمیشہ خط کا پابندی سے جواب دیتے۔

پانی پت میں ایک صفائی کرنے والالڑکا نالی میں گر پڑا۔حالی تانگے میں بیٹھے گزر رہے تھے۔حالی نے تانگہ روکا،اسے نالی سے نکالا اوراپنے ہاتھ سے کپڑے بدلے اور پتا پوچھ کراس کے گھرپر پہنچا کرآئے۔سفارشوں کے لیے لوگ انھیں بہت ستاتے تھے۔

حالی کی انھیں خصوصیات نے انھیں قبولِ عام کا درجہ عطا کیا۔ انھوں نے قدامت پسندی، روایت پرستی، جہالت اور بے عملی کوتوڑنے کا عزم کیا تھا۔انھوں نے اپنے روحانی استادوں اورزندہ استادوں سے خوب استفادہ کیا۔

صالحہ عابدحسین حالی کے بارے میں اپنے خاص انداز میں لکھتی ہیں:

’’اوّل دن سے آخری دَم تک حالی ایک مزدور کی طرح کام میں لگے رہے۔ملازمت کے فرائض کےعلاوہ مطالعہ،تصنیف وتالیف بڑی محنت اور پابندی سے انجام دیتے تھے۔ان کا اُصول تھا کہ جوکام کیا جائے پوری توجہ اورمحنت کے ساتھ کیا جائے۔‘‘

حالی کی شخصیت وسوانح پر ’یادگارِ حالی‘ بلاشبہ بڑی معتبر اور مستند کتاب ہے۔اس کتاب میں حالی کے کارناموں اورحالات وکوائف کو بڑی دیانتداری سے معروضی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

شعبۂ اردو،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ–202002،یوپی
E-mail: zia_musafe@yahoo.co.in

میر: تین صدی بعد

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

مذکورہ اشعار حقیقت پرمبنی ہیں کہ میرؔ جیسے ہمہ جہت دانشور فنکار دنیاے ادب میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔انگریزی کے قد آور دانشوراور شاعر ولیم ورڈس ورتھ نے لکھا ہے:

"We poets in our youth begin in gladness but thereof coms in the end dispondency and madness."

اور کچھ اسی طرح کی بات اٹھارہویں صدی کے شاعر روبرٹ بروفان نے کہی تھی:

"All poets are mad"

میرتقی میرؔ بھی خودکوکبھی دیوانہ توکبھی بد دماغ کہتے ہیں اوراپنی بددماغی کے باوجود ہرجنوں شعور کے ساتھ کرنے کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔اشعار ملاحظہ کیجیے:

صحبتِ کسی سے رکھنے کا اس کو نہ تھا دماغ
تھا میرؔ بے دماغ کو بھی کیا ملا دماغ

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

بہت آرزو تھی گلی کی تری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

خوش ہیں دیوانگیِ میرؔ سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

مگر میرؔ کو یہ بھی احساس ہے کہ وہ ایک بشر ہے اور وہ معاشرے سے کٹ کر نہیں رہ سکتا کہ اسے ہرحال میں انسان رہنا ہے،اس لیے وہ یہ بھی کہتے ہیں:

مرے سلیقہ سے نبھی مری محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

یہ زمانہ نہیں ایسا کہ کوئی زیست کرے
چاہتے ہیں جو برا، اپنا بھلا کرتے ہیں

میرؔ کی زندگی کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ان کا عہد تاریخی شکست وریخت کا عہد تھا۔دلّی جوان کی نگاہوں میں اوراقِ مصورتھی وہ بار بار لُٹ رہی تھی،خوں ریزی کا بازار گرم تھا،کل تک جوتخت وتاج پر براجمان تھے وہ کاسہ لیے گلی گلی پھر رہے تھے،تاحدِ نظر اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں تھا۔میرتقی میرؔ ایک حسّاس فنکار تھے اورانسانی رشتوں کے پاسدار، اس لیے دلّی کی بربادی کا غم انھیں نہ صرف نڈھال کرتا ہے بلکہ خون کے آنسو رونے پر مجبور بھی کرتا ہے۔اشعار ملاحظہ کیجیے:

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
اُس سر پہ یہاں شور ہے اب نوحہ گری کا

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

☆

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

دلّی کی بربادی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

ایسا ترا رہگذر نہ ہوگا
ہر گام پہ جس میں سر نہ ہوگا

میرؔ کی شاعری صرف دل اور دلّی کا مرثیہ ہی نہیں ہے بلکہ فلسفۂ زیست کی مکمل کتاب ہے اور جس میں انسانی زندگی کے تمام نشیب وفراز کے اوراق بکھرے پڑے ہیں۔میرؔ عظمتِ آدم کا قصیدہ خواں ہے اور وہ انسان کی تخلیق کوہی رونقِ دنیا کا ضامن سمجھتا ہے۔شعر دیکھیں:

آدمِ خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

اور یہ شعر تو زبان زدِ عام ہے:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اردوغزل کا موضوعِ خاص حسن وعشق رہا ہے اور میر بھی اس سے اپنا دامن نہیں بچا سکے ہیں لیکن میرؔ نے پیش پا افتادہ مضامین سے دامن بچاتے ہوئے حسن اور عشق کے موضوع کو جوابدیت بخشی ہے وہ صرف اور صرف میر کا ہی مقدر رہا ہے۔میر نے اپنی شہرۂ آفاق مثنوی ’معاملاتِ عشق‘ میں کہا ہے:

عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ
عشقِ بن تم کہو، کہیں ہے کچھ

مذکورہ شعر کی روشنی میں میرؔ کے تصورِ عشق کے متعلق بخوبی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ میرؔ کی عشقیہ شاعری آفاقیت کا درجہ رکھتی ہے کہ وہ عشق کو اسی نظریے سے دیکھتے ہیں:

لوگ بہت پوچھا کرتے ہیں کہیے میاں کیا ہے عشق
کچھ کہتے ہیں سرِّ الٰہی، کچھ کہتے ہیں خدا ہے عشق

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

گر عشق نہیں ہے تو یہ کیا ہے بھلا مجھ میں
جی خود بخود اے ہمدم کاہے کو کھنچا جاتا ہے

اگرچہ میرؔ عشقِ مجازی سے دامن نہیں بچا سکے تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔بقولِ میر:

میر سے پوچھا جو میں، عاشق ہو تو
ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

ہوگا کسی دیوار کے سائے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو

سراپا جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر ساری بسر کیجیے

میرؔ لسانی تنوع کا شاعر ہے اور وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ ریختہ کواعتبار کا درجہ اسی وقت حاصل ہوگا جب ریختہ قلی قطب شاہ، ولی اور ناجیؔ جیسے شعرا کی روش کو آگے بڑھائیں گے اور ریختہ کے دامن کولسانی تنوع کا مرقع بنائیں گے۔شاید اسی لیے وہ کہتے ہیں:

چلتے ہو تو چمن کو چلیے، سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں،کم کم بادوباراں ہے

مختصر یہ کہ میرتقی میرؔ کی تین سوسالہ صدی تقریبات کے موقعے پر میرؔ کی شاعری اوران کے کائناتی افکارونظریات کی شمع کو روشن کرنے کی ضرورت ہے کہ عالمی ادب میں میرتقی میرؔ کی بدولت ہی اردوشاعری کسی بھی عظیم شاعری کے ہم پلّہ رکھی جا سکتی ہے۔بقولِ میر:

نہ رکھو کان نظمِ شاعرانِ حال پر اپنے
چلو ٹک میرؔ کو سننے، کہ وہ موتی پروتا ہے

پرنسپل،سی.ایم.کالج،دربھنگہ(بہار)
E-mail: rm.meezan@gmail.com
Mob. No. 9431414586

آگرہ میں علامہ شبلی نعمانی پر فکری سمینار

(بقیہ صفحہ 5 سے آگے)

جوڑ کر ایک مثبت فکری روایت قائم کی۔ان کے نزدیک ادب محض اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ معاشرتی اصلاح اور فکری بیداری کا موثر ذریعہ ہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اقلیتی شعبے کے قومی میڈیا انچارج عدنان اشرف نے کہا کہ علامہ شبلی نعمانی کا فکری پیغام آج کے عہد میں بھی پوری طرح موثر اور قابلِ عمل ہے۔انھوں نے کہا کہ تعلیم، مکالمہ اور ادب معاشرے کو جوڑنے کا سب سے طاقتور ذریعہ ہیں۔ دیگر معزز مہمانوں میں محمد مدثر قریشی، پیرزادہ شیخ عامر قادری، انجینئر محمد عادل اور بشیر الحق راکی شامل تھے، جنھوں نے علامہ شبلی نعمانی کی علمی و ادبی خدمات کو عصرِ حاضر کے لیے نہایت بصیرت افروز قرار دیا۔سمینار کی نظامت مفتی محمد ابراہیم قاسمی (نائب صدر جمعیۃ علما، آگرہ) نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دی۔اس موقعے پر قاری محمد نجیب اللہ فرقانی، حافظ محمد حسیب، قاری محمد کلام الدین، حافظ محمد نوشاد، محترمہ صائمہ قریشی رحمانی، حافظ محمد نصر اللہ، معراج احمد، مترجمہ مہک حسین اور مولانا محمد کفیل رضا قادری سمیت متعدد اہلِ علم نے اپنے تحقیقی مقالات پیش کیے اور شبلی کی ادبی، فکری اور تعلیمی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔آخر میں سمینار کے منتظم محمد التمش رحمانی نے تمام مہمانوں، مقررین اور شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا کہ آئندہ بھی اسی طرح کے علمی وادبی پروگراموں کے ذریعے اردو زبان وادب کی خدمت کا سلسلہ جاری رکھا جائے گا۔ (سیاسی تقدیر۔دہلی)

میرؔ: تین صدی بعد

پروفیسر مشتاق احمد

عالمی ادب میں جن تخلیقی فنکاروں کو بقائے دوام حاصل ہے ان میں اردو و فارسی کے جیّد عالم و شاعر میر تقی میرؔ (1723-1810) کو اولیت حاصل ہے۔ تاریخِ ادبِ اردو اور فارسی میں میرؔ کو خدائے سخن کے ساتھ ساتھ اردو تذکرہ نگاری کا باباے آدم تسلیم کیا گیا ہے کہ 'نکات الشعراء' کے بغیر تذکرہ نگاری کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ میر تقی میرؔ کے متعلق راقم الحروف کا واضح نقطۂ نظر ہے کہ میر تقی میرؔ کی شاعری لسانی تنوع اور اجتماعی زندگی کی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ کائنات کے اسرار و رموز کی آئینہ دار ہے۔ میرؔ کی شاعری عصری آگہی، ماضی کی تہذیبی و ثقافتی وراثت، تاریخی شکست و ریخت کی داستان اور صبحِ نو کا اعلامیہ ہے۔ میرؔ کی شخصیت اور فن پر نہ جانے کتنے تنقیدی و تحقیقی مقالات و مضامین کے انبار خزینۂ ادب میں سرمایۂ عظیم کی حیثیت رکھتے ہیں اور سیکڑوں کتابیں میرؔ کے فکر و فن کا احاطہ کرتی ہیں۔ مگر ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ میر تقی میرؔ کی شاعری اور شخصیت کے بہت سے ایسے گوشے ہنوز تاریک ہیں اور وہ ضیاے انصاف کے متقاضی ہیں۔ میرؔ تنقید پر سرسری نگاہ ڈالیے تو مولانا محمد حسین آزاد، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، عبادت بریلوی، پروفیسر مختار الدین آرزو، ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، محمد حسن عسکری، ناصر کاظمی، ڈاکٹر صفدر آہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر گیان چند جین، کلب علی خاں فائق، پروفیسر مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر مسیح الزماں، پروفیسر مسعود حسن خاں، فراق گورکھ پوری، مجنوں گورکھ پوری، پروفیسر کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر آل احمد سرور، خواجہ احمد فاروقی، وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی، عندلیب شادانی، نیاز فتح پوری، فرمان فتح پوری، پروفیسر گوپی چند نارنگ، سردار جعفری، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور حالیہ دنوں میں پروفیسر شہاب الدین ثاقب و پروفیسر احمد محفوظ وغیرہ نامورانِ ادب نے میرؔ کی شاعری اور شخصیت کو اپنی تنقیدی و تحقیقی بصیرت و بصارت کے میزان پر پرکھنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے اور میرؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ میرؔ کی شاعرانہ عظمت کی قصیدہ خوانی میں غالبؔ، ذوقؔ، شیفتہؔ، اکبرؔ، حسرتؔ، میراجیؔ اور انشاؔ وغیرہ نے بھی اپنی کشادہ ذہنی و فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جہاں تک خود میرؔ کا سوال ہے تو میرؔ نے بھی اپنی شاعری کے متعلق جس قدر تعلّی کے اشعار کہے ہیں تاریخِ ادب میں شاید ہی اردو و فارسی کے کسی دوسرے شاعر نے کہے ہوں گے۔ میں اپنے محدود مطالعے کی بنیاد پر یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ میرؔ کے کم و بیش سو اشعار تعلّی پر مبنی ہیں۔ میر تقی میرؔ اپنی تعلّی میں ایک طرف یہ دعوا کرتے ہیں کہ ان کا دیوان دردوغم کا مجموعہ ہے تو دوسری طرف وہ خود کو ریختہ میں نظیریؔ کا بدل تصور کرتے ہیں۔ میرؔ یہ بھی دعوا کرتے ہیں کہ دریاے سخن میں جو صد رنگ موج ہے وہ ان کی بدولت ہی ہے اس لیے میرؔ پُر امید ہیں کہ تا حشر جہاں میں ان کا دیوان رہے گا۔ میرؔ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان سے پہلے ریختہ کو کسی نے رتبۂ اعلا نہیں بخشا اور وہ اپنی شاعری کو آبِ بیتی کے ساتھ ساتھ جگ بیتی بھی قرار دیتے ہیں اور انھیں یہ بھی زعم ہے کہ ان کے فکر و فن کو سمجھنا آسان نہیں کہ ان کا ہر سخن 'اک مقام سے ہے'۔ تعلّی کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
دردوغم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

ریختہ کا ہے کو تھا رتبۂ اعلا میں میرؔ
جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا

کیا قدر ہے ریختہ کی، گو میں
اس فن میں نظیریؔ کا بدل تھا

اگرچہ گوشہ نشیں ہوں میں شاعروں میں میرؔ
یہ مرے شعر نے روئے زمیں تمام کیا

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں

زلف سا پیچ دار ہے ہر شعر
ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

سارے عالم پہ ہوں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

بلاشبہ میرؔ کی تعلّی حقیقت پر مبنی ہے بس شرط یہ ہے کہ جہانِ میرؔ سے سرسری نہ گزر کر پورے انہماک کے ساتھ ان کے اشعار کی قرأت ٹھہر ٹھہر کر کیجیے اور دریائے معنی میں غوطہ زن ہوکر گوہرِ آبدار سے اپنا دامن بھر لیجیے۔ شاید اسی لیے میرؔ نے اپنے قاری سے یہ شکایت کی ہے:

سرسری تم جہان سے گذرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ شیفتہؔ، غالبؔ، اکبرؔ، حسرتؔ اور ان کے بعد کے شاید ہی کوئی شاعر ہوں جنھوں نے میرؔ کی عظمت کا اعتراف نہ کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ میرؔ کی کائناتی فکر اور وسعتِ نظریۂ زیست کا اعتراف نہ کرنا حدودِ کفر میں داخل ہونے کے مترادف ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہؔ لیکن
کبھی دل میں ہوائے شیوہ ہائے میرؔ پھرتی ہے
(شیفتہؔ)

اے مصحفیؔ تو اور کہاں، شعر کا دعوا
پھبتا ہے یہ اندازِ سخن میرؔ کے منہ پر
(مصحفیؔ)

نہ ہوا، پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا
(ذوقؔ)

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں
(غالبؔ)

میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبرؔ
ناسخؔ و ذوقؔ بھی چل نہ سکے میرؔ کے ساتھ
(اکبرؔ الہ آبادی)

شعر میرے بھی ہیں پُر درد و لیکن حسرتؔ
میرؔ کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں
(حسرتؔ موہانی)

میرؔ کا رنگ برتنا نہیں آساں اے داغؔ
اپنے دیواں سے ملا دیکھیے دیوان ان کا
(داغؔ دہلوی)

اک بات کہیں گے انشاؔ جی، تمھیں ریختہ کہتے عمر ہوئی
تم ایک جہاں کا علم پڑھے، کوئی میرؔ سا شعر کہا تم نے
(انشاؔ)

...(بقیہ صفحہ 7 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر: محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***